

(آخری قسط)

دُمدہبی نظام ہائے فکر

تقلیدی اور تخلیقی

الطاف جاوید

موجودہ دینی مدارس کی بنیاد و ترکیب، اُن کا انصابِ تعلیم و نظامِ کار، اپنے قیام کے لئے انہیں کن طبقوں سے مالی مدد لینا پڑتی ہے، اور اس کے نتیجے میں قدرتا اُن کی خوشنودی کا انہیں خیال رکھنا پڑتا ہے اور پھر ان دینی مدارس کی اجتماعی و ذہنی فضا۔ غرض ان سب چیزوں نے مل کر ان مدارس کو علیحدگی پسندی، فرقت پروری اور جوہد کا گڑھ بنا دیا ہے۔ یہ نہ صرف جدید علوم و فنون سے دُور ہیں۔ بلکہ اُن میں ان کے باسے میں بغض و متنفر پایا جاتا ہے۔ یہ مدارس گزشتہ کئی صدیوں سے ملت کی فکری و عملی ترقی میں سدا رہ بنے ہوئے ہیں۔ اور مسلمان جو آج دنیا کی دوسری قوموں سے زندگی کے ہر شعبے میں بہت پیچھے ہیں۔ تو اس کا ایک بڑا سبب یہاں ہے یہ مدارس ہیں۔

ان مدارس نے گزشتہ صدیوں میں ہرنئے فکر اور ہرنئے نظام کی مخالفت کر کے انکو زلشن کی یاد تازہ کر دی۔ کہا گیا ہے کہ انکو زلشن کی مثال بے محل ہے، کیونکہ یہاں کے دینی علماء نے سائنسی ایجادات کی مخالفت نہیں کی۔ مگر یہ کہتے ہوئے اس بات کو نظر انداز کر دیا گیا کہ متحدہ ہندوستان کے برطانوی عہد کے اوائل میں جب یہ سائنسی علوم اور ایجادات یہاں پہنچے تو اُس وقت ہمارا دینی طبقہ اقتدار سے محروم ہو چکا تھا۔ ورنہ ایسا کیوں ہوا کہ جس مسلم ملک میں ان جدید علمی، سائنسی اور صنعتی قوتوں نے قدم رکھا۔ تو سب سے پہلی نگرانی دینی طبقے سے ہوئی۔ اور نہ صرف مسلم ممالک میں بلکہ غیر مسلم ممالک میں بھی ایسا ہوا کہ وہاں کا مذہبی طبقہ ان ترقی یافتہ قوتوں کے اُٹے آیا۔ تاریخ اسلام کے صفحات پر کئی ایسے خونِ ناحق ہیں جو ایک زمانے میں اس مذہبی طبقے کی عقیدہ پرستی اور ظاہر نوازی کی وجہ سے، اس لئے بہائے گئے کہ اُن دنوں اسے اقتدار حاصل تھا، شیخ الاشراف اور منصور حلاج وغیرہ اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ حکماء اسلام، عقلیت کے

پشت پناہی کرنے والے متکلمین اور وقت کے دھارے کے ساتھ ملت کو قدم ملانے کی تلقین کرنے والے مصلحین اور مفکرین کے خلاف ہر عہد میں ان فقیہوں اور علمائین مذہب نے نفرت پھیلانے اور ان پر کفر کے فتاویٰ صادر فرمانے کا عمل جاری رکھا۔

وہ مذہبی زعماء جن کی زبانیں محض ان کی رائے سے اختلاف رکھنے والوں کو گستاخ، محمد و زندق، دریدہ دین اور دشمن دین و رسول جیسے القابات سے سرفراز فرماتی رہتی ہیں، اگر ان کے ہاتھ میں اقتدار دے دیا جائے تو یہ کیا کچھ نہ کر گزریں گے، اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ اگر ان دینی پیشواؤں کے عہد اقتدار میں سائنسی ایجادات اور سائنسی تفکر وجود میں آتا تو یہ ان کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھتے، جب کہ آج بھی نئے فکر کے بانیوں کے خلاف اس طبقہ کے افراد، صحت مند تنقید کی بجائے غیر محتاط لہجہ میں گفت گو فرماتے رہتے ہیں۔

لہذا محض یہ کہنا کہ قومی ترقی کو کسی عالم دین نے روکنے کی کوشش نہیں کی، محض خود فریبی اور تاریخی حقائق کے خلاف ہے۔ جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ عائلی قوانین، خاندانی منصوبہ بندی اور اسلام کی جدید تقاضوں کے مطابق تشریح و تفسیر کرنے کی اپیل کے خلاف کس کس طرح کی گوبہ افشائیاں کی جاتی ہیں۔

کہا گیا ہے کہ صدر ایوب کو مصطفیٰ کمال اور جمال عبدانہ وغیرہ کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین کرنا اسلام سے دشمنی کرنے کے مترادف ہے۔ کیوں کہ یہ حضرات اسلام سے قطعاً بے بہرہ اور ان کا رویہ دشمن دین تھا۔

اس سلسلہ میں اس سے زیادہ کیا کہا جاسکتا ہے کہ ہماری مذہبی قیادت اُس فراست مند منانہ سے محروم ہو چکی ہے جس کے متعلق نبی اکرم نے فرمایا تھا کہ ”وہ اللہ کے نور سے دکھیتی ہے“ اور اللہ کے متعلق قرآن حکیم نے بتایا ہے کہ اُس کی شان برآن بدلتی ہے۔ حضرت امام ولی اللہ نے اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اللہ کی شان کی تبدیلی ادوار تشکیل کرتی ہے۔ لہذا ان تصریحات کی روشنی میں اس حدیث مطہرہ کا مفہوم یہ ہوا کہ مومن کی فراست تاریخ کے ہر نئے دور کے نئے تقاضوں کو پہچان لیتی ہے۔ کیوں کہ اللہ اپنے آپ کو اپنی انہیں شئون متبدلہ کے ذریعہ ظاہر فرماتا ہے۔

لہذا جب جاگیر داری عہد کی شبِ طویل کا پھپھلاہٹا ہوا آگیا اور اُس کی سیاہی بھرنے لگی اور

یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی سحر طلوع ہونے لگی اور صنعتی انقلاب کا آفتاب، جب اپنی تیز روشنی اور زندگی بخش حرارت کے ساتھ چمکنے لگا، تو حق تعالیٰ کی شان نے ایک نئے ترقی پسند عہد کا آغاز کر دیا۔ تو اس جدید عہد میں زندگی نے کرۂ ارض کے ہر خطہ میں اپنے قدیم لبادہ کو اتار چھید کا، جسے عقل قیاسی، سو رمادوں کی جنگ جومہوں اور ذریعی غلامی کے تار و پود سے بنا گیا تھا۔

اس لبادہ کے اتارنے سے حیات انسانی کے وہ حقائق عیاں ہونے لگے جو آج تک ختم آدم سے پوشیدہ تھے۔ اب یہ عہد علمی تحقیق کے لئے منطق کے اصول استقراء کو استعمال کرنے، فطرت کی قوتوں پر مشغول مارنے اور انہیں مطیع کرنے، فطرت اور تاریخ کے تخلیقی ارتقاء کے عمل کو جاننے اور حرکت تغیر اور ارتقاء کو وجود کا بنیادی قانون سمجھنے کا عہد تھا۔ جہاں اس عہد میں زندگی کا ہر شعبہ نئے حقائق کے انکشاف سے دگرگوں ہوا، وہاں مذہب بھی ان سے دوچار ہوا۔ اور اُس نے بھی اس نئے عہد کو لبیک کہتے ہوئے اپنے بنیادی عقائد کی تشریح و تفسیر اس عہد کے مطالبات کے مطابق کرنے کی کوشش کی۔ مصطفیٰ کمال اور جمال عبدالناصر وغیرہ جدید صاحب اقتدار مصلحین کا جرم اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ انہوں نے مذہب کے اس نئے جامہ کو مثبت طور پر تسلیم کر لیا، جسے تاریخ کے نئے صنعتی انقلاب نے اُسے اُڑھایا تھا۔ لامحالہ اس سلسلہ میں انہیں اُس مذہبی پیشوائیت کے خلاف قدم اٹھانا پڑا، جو اسلام کے جاگیرداری عہد کے لبادہ کے ساتھ چسپی ہوئی تھی۔ انہوں نے قرآن حکیم، نماز اور اذان وغیرہ کے مطالب سے عوام کو آگاہ کرنے کے لئے مقامی زبانوں میں ادا کرنے کا تجربہ کیا۔ اور ایسی ہی ضروری اصلاحات نافذ کیں۔ جن کے نفاذ سے اسلام عہد حاضر کے تقاضوں کے ساتھ چلنے کے قابل ہو گیا۔

ہمارا مذہب ہی طبقہ چونکہ حرکت کے تخلیقی عمل کے بجائے اُس کے میکانیکی عمل کا قائل ہے۔ اس لئے اسلامی لٹریچر میں تجدید اور مجدد کے الفاظ کی تعبیر بھی حرکت کے اسی میکانیکی تصور کے ماتحت کی جاتی ہے اور عیاں ہے کہ میکانیکی حرکت دوری حرکت کا دوسرا نام ہے جو ایک ہی دائرہ میں چکر کاٹتی رہتی ہے۔ اور اس دائرہ سے وسیع تر ادوار میں قدم نہیں رکھتی۔ یعنی یہ میکانیکی حرکت تخلیقی اور ترقی پسند نہیں ہوتی۔

مگر اسلامی ادب میں تجدید کا حقیقی مفہوم تخلیقی اور ترقی پسند ہے۔ کیوں کہ اسلام تاریخ

کے تخلیقی ارتقائی عمل کو تسلیم کرتا ہے۔ اگر تاریخ کا ہر دور اپنے ماقبل دور سے وسیع تر، کامل تر اور زیادہ پرمایہ ہے تو تجدید کا مفہوم بھی یہی ہونا چاہیے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ تاریخ کے ایک نئے دور میں اسلام کو اس تشریح و تجدید سے وابستہ رکھنے پر زور دیا جائے جو اس نئے دور سے پہلے دور میں کی گئی تھی۔ دراصل حدیثِ مجدد کا مفہوم ہی یہ تھا کہ اسلام تخلیقی تجدید کے ذریعہ تاریخ کے ہر ارتقاء پذیر عہد کے مزاج کے مطابق اپنے بنیادی نظریات، عقائد اور تعلیمات کے نئے نئے پہلوؤں اور زاویوں کا مسلسل انکشاف کرتا رہے گا، جو رزاقِ الہی سے حق تعالیٰ نے اُن کے اندر محفوظ کر رکھے تھے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اس بصیرت اور فراست کو ہمارے مذہبی رہنماؤں کی بجائے حق تعالیٰ نے یورپ کی یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ ایک عبرتی پر منکشف فرمایا ہے۔ جس نے قرآن حکیم کے متعلق لکھا تھا:

صد جہاں پوشیدہ در آیات اوست
عصر با پیچیدہ از آفات اوست

اگر اس حقیقت کو مان لیا جائے، جسے اس شعر میں بیان کیا گیا ہے تو اسلام اور قرآن کی تشریح و تفسیر پر کسی مخصوص طبقہ کی اجارہ داری تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے کسی خاص فرد یا افراد کو اس کام پر مامور ہونے کی سند نہیں عطا کی۔ اس کام کو ہر وہ فرد انجام دے سکتا ہے، جو اس کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ختم نبوت کا مفہوم یہ نہیں تھا کہ اسلام کی تشریح و تفسیر کسی خاص مذہبی طبقہ کے سپرد کر دی جائے، بلکہ اس سے مراد آزادیِ فکر اور تنقیدی رویہ کی اہمیت کو سمجھنا تھا۔ اسلام میں کسی پریسٹ ہڈ یا مذہبی پیشوائیت کے لئے جگہ نہیں ہے۔ کیوں کہ اس طبقہ کے وجود میں آنے سے زندگی دینی اور دنیوی خانوں میں بٹ جاتی ہے۔ اور سادہ ذہن عوام کے مذہبی جذبات کو براگینختہ کر کے یہ آئے دن مشکلات پیدا کرتا رہتا ہے۔ لہذا مصطفیٰ کمال اور جمال عبدالناصر وغیرہ نے اپنی پس ماندہ اور شکست خوردہ قوموں کو حیاتِ تازہ بخشی ہے اور اپنی تاریخی ذمہ داری کے ماتحت اسلام کی نئی تفسیر و تجدید کی ہے۔ جس سے اس کی قدیم ہیئت و صورت کا بدل جانا لابدی تھا۔ اور تبدیلی ہیئت کو اسلام دشمنی اور اسلام کشی سے تعبیر کرنا ایک غیر عقلی بات ہے۔ ویسے بھی ان رجحانِ عظیم کے خلاف اس قسم کی بے احتیاط گفتگو اور بیان بازی پاکستان اور ان مسلم ممالک کے درمیان منافرت اور عناد پیدا کرنے کا باعث بن سکتی ہے اور اس طرح اسلامی ممالک کے اتحاد کے تصور کو بھی سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

کہا گیا ہے کہ علماء نے برس با برس کی محنت اور مطالعہ سے دینی علوم کو حاصل کیا ہے۔ اس لئے دینی معاملات میں اُن کی رائے ”سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ کسی دوسرے شخص کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ دینی معاملات میں دخل دے یا علماء کی رائے کو رد کرنے کی کوشش کرے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے علماء کے طبقہ میں ایسے افراد موجود ہیں جو دینی علوم میں کافی دست گاہ رکھتے ہیں اور اپنے مسلک اور حلقہ میں بہت اونچے مقام کے مالک ہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اُن کی یہ دست گاہ اور رسوخ فی العلم تخلیقی نہیں بلکہ تقلیدی ہے۔ اُنہوں نے ان علوم کو صرف پڑھا ہے، اُن میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ اور اس تقلیدی روش کو، درس نظامی کے دینی مضامین جیسے حدیث، تفسیر، فقہ اور علم الکلام میں ہی قائم نہیں رکھا گیا، بلکہ اُسے اُس کے غیر دینی مضامین یعنی منطق، فلسفہ، ریاضی اور طب وغیرہ میں بھی اپنالے پراصر اور کیا جاتا ہے، جن میں پچھلی کئی صدیوں سے بے حساب اضافہ ہو چکا ہے۔ اگر دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی معاشرتی اور سائنسی علوم کے ساتھ ایسا ہی تقلیدی سلوک ہوتا تو آج انسانی زندگی جامد اور ٹھہر کر رہ جاتی۔

علم چاہے دینی ہو یا غیر دینی، یہ معاشرہ اور فطرت میں عقل کے تحقیقی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جستجو میں سرگرداں رہنے والی انسانی رُوح ہر دم فطرت اور معاشرہ کے اسرار کو بے نقاب کرتی رہتی ہے۔ اور اس نقاب کشائی سے فطرت اور معاشرہ کے نئے نئے رُخ اور زاویے سامنے آتے رہتے ہیں، یہ رُخ اور زاویے انسان کے تصور حیات و کائنات میں تبدیلیاں کرتے رہتے ہیں اور یہ تبدیل شدہ تصور حیات و کائنات، مسائل حیات کانٹے نقطہ نظر سے جائزہ لیتا ہے۔ جس سے معاشرتی اداروں میں ہمہ گیر تبدیلی رونما ہوتی ہے اور نئے نئے ادارے وجود پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اس طرح حیات انسانی اپنی ہیئتِ مافیہ میں رواں دواں ایک مرحلہ سے دوسرے ارتقا پذیر مرحلہ میں قدم رکھتی ہوئی آگے بڑھتی رہتی ہے۔ لہذا کسی علم کو اُس میں اضافہ کے بغیر حاصل کرنا، اُس کے اصول و مطالب کو رٹ لینا اور غیر تخلیقی طور پر مسائل حیات پر اُسے چسپاں کرنے کی کوشش کرنا، ترقی پذیر اور جاوداں ہر دم رواں حیات انسانی کے معائنہ کو سلجھانے کی بجائے اُسے اور الجھا تا رہتا ہے۔

نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے عیسائی اور یہودی مذاہب میں بڑے بڑے جید عالم پائے جاتے تھے، جو اپنے اپنے مذہب کے علوم میں دست گاہ کامل رکھتے تھے۔ ان مذاہب میں عبادت گاہیں بھی

تھیں اور مذہبی تعلیم کے ادارے بھی، مگر یہ تمام اپنی جامد روش اور تقلید پسندی کی وجہ سے حیات سے کٹ چکے تھے۔ یہ شخصے ہوئے تخلیق نو سے عاری علوم اور ادارے زندگی کی ترقی پسند رو کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ لہذا مسائل حیات کو سلجھانے میں ناکام تھے۔ حق تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کی بعثت کی شکل میں ان علوم، عقائد اور اداروں میں ارتقاء، تخلیقی تجدید اور نئے اضافہ کا سامان مہیا کر دیا۔ اسلام کے تخلیقی عمل کی تیز رفتور موجوں نے ان بند پانیوں کے عفونت زدہ جوہروں کو پاٹ کر انہیں انکار تازہ کے آبِ جان بخش سے لبریز کر دیا۔ اسی طرح مسلمانوں نے اپنے عہد زوال علوم و افکار کو جہاں چھوڑا تھا، حیات کے ترقی پذیر عمل نے دانش مغرب کی شکل میں ان میں بے بہا اضافہ کر دیا ہے۔ ہمارے علماء کا آج فرض ہے کہ وہ سابق ادوار میں عمل الہی کی روش کو مد نظر رکھتے ہوئے اس دانش تازہ کو حاصل کر کے دین اسلام کو ایک زندہ معاشرتی حقیقت بنانے کی کوشش فرمائیں۔

جب ہمارے علماء مذہب خود اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے اور ادادہ الہی اس مقصد کو مکمل کرنے کے لئے "دان تنو لو استبدل قوماً غیبرکم" (محمد) کے قانون کے مطابق، دوسرے افراد کو تیار کرنے کی کوشش کرتا ہے تو انہیں جھلاٹ، نفرت کا اظہار کرنے اور کفر و نفاق کے فتاویٰ صادر فرمانے سے پرہیز کرنا چاہئے۔

اگر ہمارے مذہبی دانش مندوں کو کلکتہ کے شب کالج اور کراچی کے کیتھولک کالج دیکھنے کی توفیق نصیب ہو تو انہیں معلوم ہو جائے کہ زندہ قومیں اپنے مردہ اور محرف شدہ مذاہب کی تعلیم کے لئے کیا کیا جدید ساز و سامان کا بندوبست کرتی ہیں۔ ان تعلیم گاہوں میں سے شب کالج میں تو گریجویٹیشن کے بعد طالب علم کو، جو عموماً جوان ہوتے ہیں۔ تین سالہ کورس سے گزارا جاتا ہے۔ اس مدت میں اسے تمام مذاہب عالم کی تاریخ اور بنیادی تعلیمات، اس عہد کے ممتاز نظامات فلسفہ کا جامع تعارف اور بائبل کے ایک ایک لفظ کو اس کے پورے تاریخی پس منظر کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے۔ تین برس کی قلیل مدت کے بعد وہ بائبل کے تمام امکانہ شخصیات اور اقوام کے متعلق پوری جغرافیائی، تاریخی اور تہذیبی واقفیت کا مالک ہو جاتا ہے۔ کراچی کے کیتھولک کالج میں پانچ سالہ سچہ کو داخل کیا جاتا ہے اور اسے پندرہ سالہ کورس میں سے گزارا جاتا ہے۔ میں ایک دفعہ ایسے طالب علم سے ملا جو دس برس گزار چکا تھا۔ یعنی وہ پندرہ برس کی عمر میں تھا، میں اس سچے کی معلومات پر حیرت زدہ رہ گیا، وہ مذاہب عالم کی عام تاریخ

اور جغرافیائی پس منظر، عیسائیت کی بنیادی تعلیمات، فلسفہ کے اساسی قواعد اور علوم حاضرہ کے متعلق جنرل ناچ کے متعلق آنا کچھ جانتا تھا، جس کی میں توقع بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ان درس گاہوں اور اُن کے پُر مغز اور پُر وقار شخصیتوں کے مالک طالب علموں کا مقابلہ جب دین اسلام کے اساطین مذہب کے زیر ہدایت چلنے والے دارالعلوموں اور اُن میں تعلیم پانے والے طالب علموں سے کیا جاتا ہے تو اپنے آپ سے شرم محسوس ہوتی ہے اور ذہن کو احساس کمتری شدید صدمہ پہنچاتا ہے۔ درس نظامی کی تعلیم سے فارغ التحصیل طالب علموں کی قرآن حکیم کے امکانہ مذاہب انبیاء اور اقوام کے متعلق جغرافیائی اور تاریخی علم کا جائزہ لیا جائے تو ناطقہ سر بگریاں اسے کیا کہیے والا معاملہ نظر آتا ہے۔ فوری طور پر یہی کم اس طرح پوری کی جاسکتی ہے کہ علماء کے لئے ریفریشنگ کورس کا انتظام ہو۔ یہ مشورہ اس لئے پیش کیا جاتا ہے کہ ہمارے یہ بزرگ درس نظامی میں پڑھے ہوئے مضامین کے متعلق تھوڑی سی جدید معلومات حاصل کر لیں۔

آخر دین برحق کی تشریح و تفسیر کو ذہنی لحاظ سے اتنے شدید مفلس اصحاب کے سپرد کیوں کر دیا گیا ہے۔ کیا کوئی ایسی اجتماعی کوشش نہیں ہو سکتی جو ہماری مذہبی تعلیم کو اس عہد کی جدید تعلیمی سطح تک بلند کر دے۔ اور دینی تعلیم حاصل کرنے والے طالب علموں کے چہروں اور لباس سے کس میر سی اور یتیمی کے آثار نمودار ہونے کی بجائے استغناء، علو ہمتی، وقار اور گہری علمی سنجیدگی نمایاں ہو۔ کیا ان تمام دارالعلوم کو ختم کر کے کسی ایسے مرکزی دارالعلوم کو قائم نہیں کیا جاسکتا جس کا معیار تعلیم کم از کم شب کالج جیسا ہو۔ آخر وہ دن کب آئے گا کہ ہمارا مذہبی عالم بھی حیات جدید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی جرأت کر سکے گا۔ میرے خیال میں دین برحق کی نشاۃ ثانیہ کے لئے ایسے انتظام کو عمل میں لانا بے حد ضروری ہے۔

آخر میں یہ عرض کروں گا کہ میری ان گزارشات کا مقصد یہ ہے کہ ہم اس بات کا جائزہ لیں کہ ہمارے نظریات و عقائد میں کتنا زنگ آچکا ہے، ہمارے ذہنوں میں اتنی قوت ہے یا نہیں کہ وہ اپنے فکری عمل میں دقت کے تیز بہاؤ کا ساتھ دے سکیں۔ غلو اور ہستی کو اپنا کر ہم حقیقت و معنی کی کتنی مقدار کو ضائع کر چکے ہیں۔ اس بات کا پتہ لیں کہ ہماری صفوں میں کتنا انتشار اور ہماری فکری و عملی قوتوں میں کتنا ہزال اور تھکن پیدا ہو چکی ہے اور ہم نے توحید کی جگہ ثنویت کو اپنا کر اپنے آپ

پر کتنا ظلم کیا ہے ؟ -

اگر ہم دیانت داری کے ساتھ اپنی ان کمزوریوں اور خامیوں کا کھلی آنکھوں اور بیدار ذہن کے ساتھ احتساب کر سکیں تو یقیناً حق تعالیٰ کی رحمت و مغفرت ہمارے ساتھ ہوگی اور ہم اس کی مدد سے اُس خسران کو پورا کر سکیں گے، جسے کاروبار حیات کی انجام دہی میں ظلم و جہل کی روش اختیار کرنے سے ہم نے اپنے ہاتھوں کمایا ہے۔

اب میں ایک بار پھر وہی بات دُہراتا ہوں جو میں شروع میں کہہ آیا ہوں۔ عام طور پر مذہب کے بارے میں دو نظام ہائے فکر ہوتے ہیں۔ ایک تقلیدی اور دوسرا تخلیقی۔ بد قسمتی سے ہمارے ان اکثر علماء نے اول لڈکر نظام فکر کو اپنا رکھا ہے، اور اُس پر وہ سختی سے قائم ہیں اور قائم رہنا چاہتے ہیں۔

مجھے یہاں اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ہمارے یہ علماء اسلام ہی تھے، جن کی مخلص سعی و جہد کی برکت سے دین حق اپنی روایتی شکل میں آج ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ مذہبی دارالعلوم ہی ہیں جنہوں نے ہمارے قدیم مذہب ہی وراثہ کو آج تک محفوظ رکھا ہے۔ دن میں پانچ وقت حجت الی الفلاح کی گونجتی ہوئی جانفزا آواز یہ مساجد یہ درس و تدریس کا ذوق و شوق، یہ قرآن حکیم کے حفاظ کی تیاری اور اسی طرح کے دیگر مذہبی اعمال کی انجام دہی انہی عالمان دین اور اُن کے دارالعلوموں کے طفیل قائم ہے۔ اس اعتراف کے باوجود اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ پچھلے چھ صدیوں سے ان علوم مذہب اور اداروں میں جمود اور زوال پذیری اپنے قدم جما چکی ہے۔ آج مذہبی فکر و عمل اپنی نوعیت میں تخلیقی ہونے کی بجائے تقلیدی بن چکا ہے۔

ہماری یہ حالت اور بھی قابل افسوس ہو جاتی ہے جب اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسی کتابِ مقدس کے حامل ہیں جو حکمتِ الہی کے لاتناہی اور غنیمتِ تم ہونے کی تعلیم دیتی ہے، اگرچہ روشنائی کے کئی سمندر اور روئے زمین کے تمام درختوں کی اقلام انہیں لکھتے ہوئے ختم ہو جائیں۔ یہ کلماتِ الہی وجود اُس کے مظاہر اور ان کے مضمرات کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں۔ یہ حق تعالیٰ ہی ہے جو وجودِ اُس کے مظاہر کا اول و آخر بھی ہے اور ظاہر و باطن بھی۔ یہ اللہ ہی ہے جس کا نور سادات و ارض میں پھیلے ہوئے مظاہر وجود کی صورت میں ہم پر عیاں ہو رہا ہے۔ اور یہ وجودِ مطلق ہی ہے جو ہر آن اپنی نئی شان میں جلوہ گر رہتا ہے۔ لہذا قافلہ وجود کی رفتار و حرکت میں کہیں بھی اور کسی لمحہ بھی ٹھہراؤ کو تسلیم کرنا قرآن حکیم کی حکمتِ بالغہ کے خلاف ہوگا۔

کیوں کہ قرآن اپنے فکری عمل (پراسس PRACESS) میں جو داور رجعت پسندی کو کسی شکل میں بھی قبول نہیں کرتا۔

چونکہ زمان و مکان کے اس محسوس مرحلہ میں کوئی شے یا شخصیت مکمل نہیں ہے۔ لہذا تنقید سے گھبرانے کی بجائے اُسے بلیک کہنا چاہیے۔ کیونکہ تنقید ہی ایک ایسی چیز ہے، جس کے ذریعہ ہم اپنے انفرادی اور ملی وجود اور اُس کے تقاضوں کو مکمل کر سکتے ہیں۔ تنقید بد صورتی کی تہ میں چھپے ہوئے حُسن کو کرید کر باہر لانے کا نام ہے۔ تنقید ایک اُنسینہ ہے، جس میں ہم اپنے چہرے کے داغ بھی دیکھ سکتے ہیں اور اپنے حُسن کو بھی۔ تنقید بدن کے اُس حصہ کی نشان دہی کرتی ہے، جہاں بیماری اپنا قبضہ جا چکی ہے اور عیاں ہے کہ طبقہ علماء میں بھی پانچوں انگلیاں ایک جیسی نہیں ہیں۔ تنقید عمل کے لئے مہینر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ تنقید کرنے والا ذہن آسانی نہیں ہوتا۔ وہ بھی ملی وجود کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ ملت کی نومندی یا کمزوری سے وہ بھی متاثر ہوتا ہے۔ مگر فرق صرف اتنا ہے کہ وہ بے لوث، غیر جانبدار اور مفاد پرستی سے الگ ہو کر جب مطالعہ کرتا ہے تو اس قابل ہو جاتا ہے کہ معروضی حقیقت میں اگر کہیں جھول آچکا ہے تو اُسے درست کرنے کی کوشش کی جائے۔

یہ سمجھنا بھی شدید غلطی ہے کہ علماء مذہب وجود ملی سے ماوراء وجود رکھتے ہیں۔ یہ بزرگ شخصیتیں ملت کے وجود کا ایک قابل قدر حصہ ہیں۔ لہذا اُن پر تنقید دراصل اپنے آپ پر اور پوسے ملی وجود پر تنقید کرنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ جسم کے ایک حصہ کا بگاڑ پورے جسم کی صحت و قوت کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ غلطی اور کجی ہر عضو میں پیدا ہو سکتی ہے۔ لہذا حق تعالیٰ کی نئی شان اور اس کے تقاضوں کے مطابق اگر مذہبی علوم اور اداروں میں مناسب تبدیلیاں عمل میں لانے کا مشورہ دیا جائے تو اُس پر چین بچیں ہونے کی بجائے ہمدردانہ غور و فکر کرنا ہی مومنانہ فرست کی دلیل ہے۔

آخر میں اُن الفاظ کو دہراتا ہوں جن میں علامہ اقبالؒ نے کبھی ہی خواہ ان ملت سے اپیل کی تھی

قمارِ زندگی مردانہ بازی

بیاتاکار ایں اُمت بسازیم

کردل در سینہ طاغرانیم

چنان نالیم اندر مسجد شہر